کوڑے کا مول

عمرانہ نعیم

دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھا وہ شخص جیسے وقت کے باہر کسی اور دنیا میں بیٹھا تھا۔ اس کی عمر کا تعین کرنا مشکل تھا۔ چہرے پر پڑی جھریاں بتاتی تھیں کہ زندگی اس پر خاصی مہربان نہیں رہی، اور نظریں...؟ بس جیسے برسوں سے کچھ دیکھنے کی بجائے یاد رکھنے کی عادت بنا چکی ہوں۔ شہر کے ایک پرانے محلے میں وہ ایک درخت کے سائے کے نیچے بیٹھا، اپنے سامان کو گود میں لیے، زمین پر پاؤں رگڑتا رہتا تھا۔ سامان؟ ایک پرانا تھیلا، کچھ رسی، چند ٹوٹے برتن... اور ایک کوڑا۔

ہاں، وہی کوڑا...

جسے وہ ہر شام نہایت ترتیب سے صاف کرتا، اور خاموشی سے اپنے ساتھ رکھتا جیسے وہ کوئی قیمتی چیز ہو۔ کبھی کبھار کوئی بچہ پوچھ بیٹھتا:

چچا! اس کوڑے کا کیا کرو گے؟

تو وہ مسکرا کر کہتا:

"بیچنے کا سوچ رہا ہوں۔۔ شاید کسی کو ضرورت ہو..."

اور پھر ہنس ہنس کر اس کے ہونٹ کانپنے لگتے۔ کبھی وہ ہنسی سچی لگتی، کبھی دعا جیسی، اور اکثر... جیسے کسی جنازے کے بعد کی خاموش دعا ہو۔

لوگ کہتے تھے وہ پاگل ہے، مگر کچھ آنکھیں جانتی تھیں کہ وہ پاگل نہیں... پچھتاوے کا پیکر ہے۔ کبھی وہ سارا دن یونہی بیٹھا رہتا، اور شام کو اچانک خود کو وہ کوڑا مارنے لگتا۔ نہ زور سے، نہ دکھاوے سے، بس جیسے کوئی آدمی اپنے اندر کے مجرم کو سزا دیتا ہے۔

وہاں، اس گلی کے موڑ پر ایک جامن کا درخت تھا پتہ نہیں کیوں، وہ روز اس درخت کو بہت دیر تک تکتا رہتا تھا۔ کبھی پتہ ہلتا، تو اس کی آنکھوں میں نمی آجاتی۔

شاید...

کسی کو کبھی اس درخت سے کچھ لینے نہیں دیا گیا تھا۔

اسے کوئی "صفدر" کہتا تھا۔ پر کسی نے اس کا پورا نام بہت عرصے سے نہیں پکارا تھا۔ وہ خود بھی اپنے نام کو جیسے بھول چکا تھا... بس کوڑا تھا، درخت تھا، اور کچھ ان کہے راز جو اس کی آنکھوں کے پیچھے بند تھے۔

درخت آج بھی وہیں تھا۔

مگر اب وہ سایا نہیں دیتا ۔۔

کیونکہ صفدر خود سائے میں رہنے لگا تھا۔

وہ اکثر اس گلی کی نکڑ پر بیٹھا رہتا، جہاں دن سست روی سے گزرتے تھے، اور شامیں کچلے ہوئے خوابوں کی طرح خاموش ہو جاتی تھیں۔ ہوا میں سردیوں کی پہلی نمی گھل رہی تھی، اور صفدر اقبال اپنے کندھوں پر اوڑھے اس چادر کو بار بار درست کر رہا تھا جو نہ گرم تھی نہ پرانی ، بس ضروری تھی... جیسے کچھ رشتے ہوتے ہیں۔ وہ آج بھی اس جامن کے درخت کے نیچے بیٹھا تھا، جس کی جڑوں میں دفن کوئی وقت، کب سے سانس لے رہا تھا۔

وہ درخت...

جسے اُس نے نہیں لگایا تھا۔۔

وہ اماں نے اپنے ہاتھوں سے بویا تھا،

جس دن صفدر پیدا ہوا تھا۔ درخت بڑا ہوتا گیا، صفدر بھی... مگر فرق یہ تھا کہ درخت نے ہر موسم میں سایہ دیا اور صفدر... ہر موسم میں خاموشی۔

اسے اماں کی کھنکتی آواز یاد آئی:

"صفدر! جامن پکے ہوں تو مجھے بتانا... پچھلی بار تم نے مجھے ایک بھی نہیں دیا تھا!"

صفدر کا دل جیسے خود سے نظریں چُرانے لگا۔

ماں کی وہ چمکتی آنکھیں، جو اُس درخت کو یوں تکتیں جیسے کسی پیارے بیٹے کی پیشانی چوم رہی ہوں۔ مگر صفدر تب خاموش رہا تھا۔۔۔ بیوی کا حکم تھا۔

"مت دینا اماں کو!

ان کی ساری حرکتیں دکھاوے کی ہیں... تم کچھ سمجھتے کیوں نہیں؟"

شگفتہ کا لہجہ وہی تھا۔۔

میٹھا، مکار، اور اندر سے خالی۔

تب صفدر محبت کے نام پر خود سے چھین لیا گیا تھا۔ اسے لگا تھا شوہر بننا بیٹا بننے سے بڑا رتبہ ہے۔ مگر اسے کیا معلوم تھا کہ جو ماں کی دعاؤں سے منہ موڑ لے، وہ عورت کی مسکراہٹ سے کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا۔ اماں آخر کار خاموش ہو گئیں۔

نہ روئیں، نہ پکارا... بس ایک دن چپ چاپ مر گئیں۔

صفدر تب بھی کچھ نہ بولا۔۔

بس ایک کمبل ان کے قدموں میں رکھ کر دیر تک ان کے بند ہاتھوں کو دیکھتا رہا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ہاتھ صفدر سے کچھ چھیننے نہیں... کچھ معاف کرنے اٹھے تھے، مگر آخری سانس نے انہیں مکمل دعا نہ بننے دیا۔

اور پھر... دن گزرے۔۔۔

نوکری چھننے کی اطلاع صفدر کو یوں دی گئی جیسے کوئی آخری رشتہ کٹ گیا ہو۔

"آپ اب کمپنی کی پالیسی کے مطابق نہیں رہے، صفدر صاحب... ہمیں نوجوان خون کی تلاش ہے!"

وہ "پالیسی" لفظ آج بھی اس کے کانوں میں آتا ہے تو وہ جھرجھری لے لیتا ہے۔ کیا دنیا میں خدمت، وقت، وفا کی بھی کوئی پالیسی ہوتی ہے؟

جب وہ خبر لے کر گھر آیا

شگفتہ نے ہنسی روکنے کی کوشش کی تھی... مگر اس کی آنکھیں بول گئی تھیں:

"آخرکار... تم وہ ہو گئے،

جو نہ ماں کے کام آئے، نہ میرے۔"

صفدر کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ بس گردن جھک گئی... ایسے جیسے وہ پوری زندگی کے آگے سرنگوں ہو گیا ہو۔

پھر ایک دن دروازہ بند تھا۔ دروازے پر ایک کاغذ چپکا ہوا تھا

جس پر لکھا تھا:

"یہ مکان اب میرا نہیں، تمہارا بھی نہیں۔

میں جا رہی ہوں...

اور تم... وہی بن گئے ہو، جسے دنیا اب 'کوڑا' کہتی ہے۔"

اور ہاں...

تب سے، صفدر کے پاس صرف ایک چیز بچی

کوڑا۔

نہ بیوی، نہ گھر، نہ سایا...

بس وہ کوڑا...

جو ہر روز صفدر سے پوچھتا تھا:

"آج کتنے زخم تمہیں یاد آئے؟

چلو، ایک مار لو... تاکہ تم بھول سکو۔"

نہیں، یہ کوڑا کسی دکان سے نہیں لیا گیا تھا۔ نہ کسی بھکاری کا بچا ہوا تھا۔ یہ اسی شام کا کوڑا تھا، جب اماں کی قبر سے لوٹتے ہوئے وہ خاموش اندر داخل ہوا تھا، اور شگفتہ نے پوچھا بھی نہیں تھا کہ ماں کو دفنانے میں کیسا لگا۔ اس کے بجائے، شگفتہ نے اپنے ہاتھ سے وہ کوڑا اٹھایا تھا اور صفدر کی کمر پر پوری طاقت سے مارا تھا۔

"مرد بنو، بیکار آنسو بہانا چھوڑو!"

اس دن صفدر چپ چاپ کوڑا زمین سے اٹھا کر اپنے تھیلے میں رکھ آیا تھا۔

اس نے پہلی بار سوچا تھا:

"شاید اب سزا کا حق دنیا کا نہیں، میرا ہے۔"

تب سے وہ کوڑا اس کے ساتھ تھا... نہ بوجھ، نہ ہتھیار... بس ایک آئینہ، جس میں وہ روز خود کو دیکھتا، اور اگر کچھ نہ کماتا، تو ایک ضرب اپنی پیٹھ پر لگا لیتا ایسی بے آواز مار، جس کی گونج صرف اس کی یادوں میں سنائی دیتی۔

اور اب جب وہ جامن کے درخت کو دیکھتا، تو اسے صرف پتوں کی سرسراہٹ نہیں، اپنی ماں کی دبی دبی کراہیں سنائی دیتیں۔

"صفدر... ایک گھونٹ پانی..."

وہ جملہ صفدر کو کوڑے سے زیادہ درد دیتا تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا

کوڑا...

اب صرف لکڑی نہیں، کفارہ ہے۔

دن کی دھوپ جیسے مٹی پر لیٹی ہوئی تھی۔ گلی کی اینٹیں پرانی تھیں، مگر اس روز کچھ اور ہی پرانا محسوس ہو رہا تھا صفدر اقبال کا جھکا وجود، جو سورج سے نظریں چرا کر زمین سے ایسے لپٹا تھا جیسے گناہ قبر میں اپنے آپ سے لپٹتا ہے۔

آج دو دن ہو چکے تھے کہ صفدر نے کچھ بیچا نہیں تھا۔ نہ کوئی بوتل، نہ کباڑ، نہ پرانی رسی... نہ کوئی پرانی کہانی۔

تھیلے میں پڑا ہوا کوڑا

خاموش تھا—

مگر صفدر کی پشت پر اس کا درد جاگ رہا تھا۔ چپکے سے اُس نے کوڑا نکالا۔ ادھر اُدھر دیکھا۔ محلے کے لوگ گھروں میں تھے، کچھ بچے کرکٹ کھیل رہے تھے، مگر صفدر جانتا تھا، اندر کے درد کو کوئی بھیڑ ماند نہیں کر سکتی۔ اُس نے کوڑا آہستہ سے اٹھایا، اور جیسے کسی سزا کے مجرم کو دیکھے بغیر مارا جاتا ہے، ویسے ہی ایک ضرب اپنی پیٹھ پر لگائی۔

پھر دوسری...

پھر تیسری...

ہر ضرب پر ایک پکار نکلتی تھی،

مگر زبان سے نہیں،

آنکھوں سے۔

ایک نوجوان، جس کی عمر شاید بیس کے پیٹے میں ہو گی،

سائیکل کے ساتھ رک گیا۔

نام تھا: احسن

اس نے بہت دنوں سے صفدر کو وہیں بیٹھے دیکھا تھا، مگر آج پہلی بار اُس نے دیکھا کہ یہ آدمی کچھ بیچتا نہیں… یہ آدمی خود کو بیچتا ہے۔ احسن آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے صفدر کے قریب آیا۔اس کے ہاتھ میں پانی کی بوتل تھی۔

اس نے بیٹھ کر صفدر کو دیکھا اور نرمی سے بولا:

"چچا… یہ کوڑا کتنے کا بیچتے ہو؟"

صفدر نے چونک کر اسے دیکھا۔ پہلی بار کسی نے اس سے کچھ خریدار کے لہجے میں پوچھا تھا۔

اُس کی آنکھوں میں کچھ تیرنے لگا۔

شاید پانی…

شاید یاد…

شاید پچھتاوا…

شاید سب کچھ۔

"یہ… یہ بیچنے کی چیز نہیں، بیٹا…"

صفدر کی آواز میں تھکن نہیں، خوف تھا۔

احسن مسکرایا،

مگر وہ وہ مسکراہٹ نہ تھی جو ہمدردی میں دی جاتی ہے وہ ایسی تھی جیسے کوئی دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ رہا ہو:

"میں جانتا ہوں… تم نے خود کو کتنی بار مارا ہے۔

اب وہ مار میرے حوالے کر دو۔"

صفدر کے ہاتھ لرز گئے۔ اُس نے کوڑا احسن کو تھمایا، جیسے کوئی باپ اپنے پچھتاوے کی وراثت بیٹے کو دینا چاہے، مگر شرمندہ ہو۔احسن نے کوڑا لیا، پانی کی بوتل صفدر کو دی،

اور بس اتنا کہا:

"چچا… اب خود کو مت ماریئے۔

آپ کے حصے کا درد… آج سے میرا ہے۔"

صفدر کے آنسو رواں تھے۔ وہ چُپ بیٹھا تھا، مگر اندر سے وہ جیسے کسی عدالت سے باعزت بری ہو گیا ہو۔ پہلی بار کسی نے اس کے زخم کا نرخ لگایا تھا۔ اور وہ قیمت... رحم نہیں، عزت تھی۔

صفدر کو اب کوڑا تھمانا نہیں پڑتا تھا۔ احسن ہر شام آتا، سلام کرتا، اور صفدر کی آنکھوں کی نمی کو جیسے آنکھ بھر کے پی لیتا۔ زندگی تھوڑی تھوڑی کھلنے لگی تھی، جیسے خزاں رسیدہ درخت کی شاخ پر کوئی نئ کونپل پھوٹتی ہو خوفزدہ، ہچکچاتی، مگر ضدی۔

پھر ایک دن، احسن کے ساتھ ایک عورت آئی۔ وہ خاموش تھی۔ آنکھوں میں تھکی تھکی سی روشنی تھی، جیسے کسی نے بہت راتیں جاگ کر خوابوں کو دفن کیا ہو۔

نادیہ

وہ احسن کی جاننے والی تھی۔ ایک فلاحی ادارے سے وابستہ، جہاں وہ تنہا، بیمار، بھولے بسرے لوگوں کی خیر خبر رکھتی تھی۔ نادیہ نے صفدر کو پہلی بار دیکھا تو

کچھ نہ کہا

بس اُس کی پشت کی طرف دیکھا،

جہاں کوڑے کے نشان اب بھی نئے لگتے تھے۔

اور تب، نادیہ کے اندر کی ماں، بہن، بیوی... سب خاموش عورتیں ایک ساتھ جاگ گئیں۔

چند دن گزرے۔

نادیہ نے کہا:

"ہماری چھوٹی سی کینٹین ہے...
آپ وہاں بیٹھیں گے ؟
سامان بیچیں، چائے پیئیں، اور... تھوڑا مسکرائیں ؟"
صفدر خاموش رہا۔ کیونکہ وہ مسکراہٹ بھول چکا تھا... اور بھولی ہوئی ہنسی، بعض اوقات رونے سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ مگر نادیہ کی آواز میں کوئی زبردستی نہ تھی، بس سہارادینے والی تھکن تھی۔

صفدر وہاں جانے لگا۔ کینٹین میں بچوں کی آوازیں، چائے کی خوشبو، اور وہ پرانا صوفہ جس پر بیٹھ کر وہ گھنٹوں درخت کو دیکھتا، اور سوچتا...
"کاش... وقت تھوڑا سا پیچھے چلا جائے۔"

نادیہ کے بچے بھی تھے، دو بیٹے، ایک بیٹی۔ شوہر مر چکا تھا۔ ایک پرانی زندگی، جس کی قبریں وہ ہر رات بند کر کے سوتی تھی۔ صفدر نے کبھی اُن بچوں کو غور سے نہیں دیکھا، مگر ایک دن جب چھوٹا بیٹا اس کے پاس آکر بولا:
"انکل! آپ کے ہاتھ میں کوڑا نہیں ہوتا اب ؟"
تو صفدر نے پہلی بار
بنا ہنسے،
بس سر ہلایا...

"نہیں، بیٹا... اب میرے ہاتھ میں کچھ نہیں۔
اب میرے ہاتھ خالی ہیں، شاید دعا کے لیے..."

وہ رات سرد تھی، اور صفدر بہت دیر تک کینٹین کے بینچ پر بیٹھا رہا۔ نادیہ چائے بنا کر لائی تو اس نے کپ ہاتھ میں لیتے ہوئے پہلی بار اس کی آنکھوں میں دیکھا۔
وہ آنکھیں...
جو آواز نہیں نکالتیں، مگر چیختی ہیں۔ شاید نادیہ نے بھی اُس لمحے کچھ پڑھ لیا، زخم، وقت، اور اکلاپے کی وہ عبارت، جو صفدر نے برسوں چھپا رکھی تھی۔ خاموشی کے اندر سے ایک نرم سا سوال نکلا:
"کیا ہم دو ٹوٹے لوگ،
ایک مکمل زندگی بنا سکتے ہیں؟"
نادیہ نے کچھ نہیں کہا
بس چائے کا کپ اُس کے قریب رکھا،
اور بچے کو آواز دی:
"بیٹا! انکل کے لیے کمبل لے آؤ،
رات ٹھنڈی ہو گئی ہے..."

ہسپتال کی راہداری میں صرف سفید دیواریں نہ تھیں وہ دیواریں صفدر کے دل میں بنی دراڑوں کی طرح لگتی تھیں، جہاں ہر درخت، ہر سایہ، اور ہر یاد کسی کونے میں دبکی بیٹھی تھی۔ زندگی کی ساری گلیاں گھومنے کے بعد

آج وہ ایک دروازے کے سامنے کھڑا تھا، جہاں اسے اپنا ماضی ہوش میں، سانس لیتا ہوا ملنے والا تھا۔ نادیہ کی آواز اب بھی اس کے کان میں گونج رہی تھی:

"صفدر... مریضہ تنہا ہے،

نام شگفتہ ہے..." بس نام۔۔۔۔

"شگفتہ" —

یہ نام زبان پر آتے ہی
جیسے صفدر کے سینے میں کوئی بند دروازہ چرچرا کر کھل گیا ہو۔ وہ دروازہ جہاں چیخیں قید تھیں، سوال لٹکے تھے، اور معافی... کبھی دی ہی نہیں گئی تھی۔ راہداری میں چلتے ہوئے صفدر کو یوں لگا جیسے ہر قدم کسی پرانی بیوفائی پر پڑ رہا ہے۔ ہر سِق ceiling light کسی ان دیکھی سزا کی طرح اس کے سر پر جھکی ہوئی تھی۔
اُس کے ہاتھ...
جن سے برسوں پہلے دعا چھن گئی تھی،
آج خالی تھے
اور خالی ہاتھ جب دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں، تو اندر صرف خاموشی جواب دیتی ہے۔

دروازہ کھلا۔ ایک دھندلا سا کمرہ... اکیلی عورت... بہت سی نلکیاں... اور ایک شکستہ غرور۔
شگفتہ۔
نہ آنکھوں میں افسوس تھا، نہ زبان پر دعا، نہ ماتھے پر ندامت۔ جیسے وہ اب بھی وہی ہو جو اماں کے حصے کا پانی روک دیتی تھی، جو کوڑا صفدر کے ہاتھ میں رکھ دیتی تھی، اور خود اپنے غرور میں چھپ جاتی تھی۔
صفدر کچھ لمحے کھڑا رہا۔
دل دھڑک رہا تھا، مگر چہرہ پتھر ہو چکا تھا۔۔۔ پھر دھیرے سے بولا:

"میں آیا ہوں، شگفتہ... مگر نہ بدلہ لینے، نہ تمہیں گرا ہوا دیکھنے۔ میں صرف یہ دیکھنے آیا ہوں کہ غرور کی چھت بھی ایک دن ٹپکنے لگتی ہے۔"

شگفتہ نے پلکیں جھپکائیں،

اور ایک قطرہ آنکھ سے ڈھلک کر تکیے میں جذب ہو گیا نہ آنسو تھا، نہ معافی...بس شاید کسی اَن کہی شکست کی پہلی علامت۔ صفدر نے ایک آخری نظر ڈالی۔ کمرے میں اک عجب سی ٹھنڈ تھی نہ سردی کی، نہ دوائیوں کی...

بلکہ اُس وقت کی جو آخر کار حساب مانگنے آ چکا تھا۔

وہ پلٹا،

تو لگا جیسے پیچھے صرف ایک جسم چھوڑ آیا ہو

روح تو برسوں پہلے مر چکی تھی۔

نادیہ باہر کھڑی تھی، ہاتھ میں چائے کا کپ، اور آنکھوں میں وہ سوال جو لفظوں میں نہیں ہوتا، بس خاموش ہاتھ تھام لیتا ہے۔ صفدر نے کپ لیا،

اور پہلی بار... ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ آئی

جو دھڑکن سے نہیں، بخشش سے جنم لیتی ہے۔

شام کا آسمان گہرے نارنجی رنگ میں ڈوبا ہوا تھا، جیسے کسی پرانے زخم پر مہندی رکھی گئی ہو۔ ہوا میں وہ خاموشی تھی جو صرف اُس وقت اترتی ہے۔ جب کسی نے بہت کچھ سہہ کر... آخر کار چھوڑ دینا سیکھ لیا ہو۔

صفدر درخت کے نیچے بیٹھا تھا

وہی پرانا درخت، جو کبھی بے گناہی کا گواہ بنا، اور پھر برسوں اس کے دل کے اندر اگ آیا۔ آج اُس کے ہاتھ میں کچھ اور نہ تھا...نہ کباڑ، نہ شکستہ سامان، بس ایک تھیلا جس میں صرف ایک چیز باقی رہ گئی تھی:

کوڑا۔

یہ کوڑا لکڑی کا نہیں رہا تھا یہ اب ایک زندہ علامت تھا، اُس کے ہر دن کا جو اس نے چپ رہ کر گزارا، ہر رات کا جو اماں کے بغیر گزری، اور ہر صبح کا، جس میں وہ امید لے کر نکلا مگر ذلت لے کر لوٹا۔ کوڑا اُس کی پشت پر لگا ہر وار تھا، اور ہر وہ لمحہ، جب اُس نے خود کو خود سزا دی... صرف زندہ رہنے کے لیے۔

احسن خاموشی سے تھوڑے فاصلے پر کھڑا تھا

جیسے وہ ایک زندگی کا گواہ ہو۔ نادیہ قریب تھی، اس کی خاموش آنکھوں میں روشنی نہیں، بلکہ تسلی کا سایہ تھا۔

صفدر نے کوڑا نکالا۔

لمحہ بھر کو اسے دیکھا، جیسے کوئی شخص اپنے دشمن کے چہرے کو آخری بار دیکھتا ہے اور پھر معاف کر دیتا ہے صرف خود کو آزاد کرنے کے لیے۔ ایک چھوٹا سا الاؤ روشن کیا گیا۔

کوڑا جب آگ کی لپیٹ میں گیا،

تو کوئی چیخ نہ نکلی،

نہ لکڑی ٹوٹنے کی آواز آئی

بس صفدر کی آنکھ سے ایک آنسو گرا...

نہ کمزوری میں، نہ دکھ میں،

بلکہ بے وزنی میں۔

نادیہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ چند لمحے خاموشی میں ڈوبے رہے، پھر اُس نے دھیرے سے کہا:

" کبھی کبھی انسان کو اپنے ماضی کو جلانا نہیں پڑتا، بس قبول کرنا پڑتا ہے...

اور پھر وہ خود ہی راکھ بن جاتا ہے۔ "

صفدر نے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں پہلی بار کوئی دعا تیر رہی تھی
نہ کسی مول کی، نہ معافی کی،
بس جینے کی اجازت مانگتی ہوئی۔
کچھ دور، بچے کھیل رہے تھے۔ کوئی ہنس رہا تھا، کوئی گری ہوئی گیند اٹھا رہا تھا۔
اور صفدر...
پہلی بار ان ہنسیوں میں شامل ہو گیا،
کسی تماشائی کی طرح نہیں،
بلکہ جینے والے کی طرح۔

زندگی کبھی ہمیں دوسروں کے ہاتھوں نہیں توڑتی، ہم اکثر اپنے ہی ہاتھوں سے خود کو سزا دیتے ہیں۔ کبھی کسی رشتے کی بے وفائی پر، کبھی اپنی بے بسی پر، اور کبھی ان باتوں پر جو ہم کہہ نہیں سکے... بس اندر دبا لیے، اور پھر روزانہ خود پر برسنے لگے۔
صفدر کا کوڑا...
صرف ایک لکڑی کا ٹکڑا نہیں تھا
وہ ان دیکھے گناہوں، بے آواز دکھوں، اور تھکے ہوئے خوابوں کی علامت تھا جو ہم سب اپنے دل میں کہیں نہ کہیں لیے پھرتے ہیں۔ ہم جیتے ہیں، مگر جینے کے لیے نہیں بلکہ خود کو سزا دینے کے لیے۔
اور پھر ایک دن،
کوئی آتا ہے
جو ہمیں نہیں بچاتا، بس ہمیں یاد دلاتا ہے
کہ تم سزا کے قابل نہیں تھے...

تم بس اندر سے زخمی تھے۔ اصل نجات تب ملتی ہے جب ہم اپنے ماضی کو ہاتھ میں لے کر اسے نہ چھپائیں، نہ بھاگیں، بلکہ آگ کے حوالے کر دیں، اور پہلی بار، ہلکے دل کے ساتھ جینا سیکھیں۔

کیونکہ...

جو انسان خود کو معاف نہیں کر سکتا ،

دنیا کی کوئی روشنی اسے سکون نہیں دے سکتی۔

عمران نعیم